بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

دریافت،تحقیق و حواشی: نجیبہ عارف*
ترجمۂ متن و تعاون: جواد ہمدانی**

جنوبی ایشیا میں اوّلین سفرنامۂ انگلستان: ’تاریخ جدید‘

نجیبہ عارف / جواد ہمدانی

سفرنامے، یادداشتیں اور روزنامچے، محض ایک فرد کے حسابِ مہ و سال کا میزانیہ نہیں ہوتے۔ یہ ایک قوم، ایک عہد، ایک طرزِ زیست، ایک معاشرت اور ایک تہذیب کا آئینہ بھی ہوتے ہیں جو زمان و مکاں کے دبیز پردے کے پار جھانک لینے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ سیر و سفر، نامعلوم کی دریافت کی سرخوشی، حیرت اور مسرت کا جو بے پایاں احساس فراہم کرتے ہیں، اسے اگر کسی نہ کسی صورت دوسروں تک منتقل کر دیا جائے تو وہ صدیوں تک علم و آگاہی کی روشنی بن سکتا ہے۔ سفرنامہ باطن و ظاہر، اندرون و بیرون اور داخل و خارج کا ایسا امتزاج ہے جس میں تماشائی خود بھی تماشے کا روپ دھار لیتا ہے اور کچھ مدت گذر جانے کے بعد اس کی تحریر سہ ابعادی گہرائی کی حامل ہو جاتی ہے۔ ایک طرف اس مقام اور زمانے کی تصویر جس کا اس نے مشاہدہ کیا، دوسری طرف خود اس کی نظر، جس کے زاویے اور نقطے اس کے ذہن و فکر کا عکس دکھاتے ہیں اور تیسری طرف اس کا اپنا عہد، طرزِ زیست، معاشرت اور قومی و اجتماعی صورتِ حال، جس کے پس منظر میں سفر کی تفاصیل اجاگر ہوتی ہیں؛ یہ تینوں ابعاد سفرنامے کی لازمی جہات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغربی علمی روایت میں سفرناموں کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ یوں تو قدیم مشرقی روایت میں

بھی سفرناموں کو نامعلوم اور اجنبی دیاروں سے شناسائی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اٹھارویں صدی تک ہندوستان میں سفرنامے تحریر کرنے کی روایت نسبتاً کمزور رہی ہے۔اس کے برعکس، انگلستان، جو ایک طویل عرصے تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر قابض رہا ہے، نہ صرف سیاسی وعسکری میدان میں غالب قوت رہا بلکہ علمی وفکری اعتبار سے بھی نمایاں رہا ہے۔اس علمی وفکری برتری کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جنھیں یہاں زیرِ بحث لانا مقصود نہیں لیکن ان میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ یورپ کی دیگر اقوام کی طرح، انگلستان کے باشندوں نے بھی، دیگر خطوں کے متعدد سفر کیے اور ان سفروں کی باقاعدہ روداد مرتب کی جس میں ان تمام اجنبی خطوں کے مفصل حالات درج کیے۔[1] یہی معلومات بعد ازاں سیاسی وعسکری غلبے کے حصول کے لیے استعمال کی گئیں اور انھی کی مدد سے دنیا کے نقشے میں ترمیم وتحریف کی گئی۔دوسری طرف انھی کی بنیاد پر شرق شناسی کی وہ عظیم الشان تحریک رونما ہوئی جس نے ترقی یافتہ ممالک کو ان تہذیبی وثقافتی مظاہر سے روشناس کیا جو ان کی محدود اور یک رنگ دنیا سے دور، پھل پھول رہے تھے۔

اس کے برعکس، گذشتہ تین صدیوں کے درمیان اگر دیارِ مغرب کے ایسے اسفار کی تفاصیل تلاش کی جائیں جو انھی مقاصد کے تحت، مشرقی ممالک کے باشندوں نے کیے ہوں تو خاصی مایوسی ہوتی ہے۔سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ جانے والے لوگ تو بے شمار تھے، لیکن ان کے سفر کے مقاصدو نتائج سراسر انفرادی اور محدود نوعیت کے تھے۔[2] ان میں سے بیشتر کا کوئی باقاعدہ دستاویزی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو ان کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے کا رواج ابھی عام نہیں ہوا۔تاہم اب، اکیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں، ایسے سفرناموں کا سماجی وسیاسی مطالعہ کئی پہلوؤں سے معنی خیز ثابت ہو سکتا ہے۔خاص طور موجودہ حالات میں، جب کہ اسلام اور مغرب جیسی غیر مساوی اصطلاحوں کی مدد سے دنیاے اسلام اور یورپی اقوام کے درمیان آویزش و تصادم کی چنگاریوں کو ہوا دینے کا عمل اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے، یہ جاننا ضروری ہے کہ مغرب کے دنیاے اسلام کے بارے میں بیشتر دعووں کی اصل حقیقت کیا ہے اور کیا واقعی اہلِ اسلام اصلاً مغربی تہذیب وثقافت سے متنفر اور متصادم رہے ہیں یا یہ ایک مصنوعی طور پر تراشیدہ منظر ہے جسے مخصوص مقاصد کے لیے

استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

سترھویں سے انیسویں صدی تک ہندوستان سے انگلستان جانے والے مسافروں کی تعداد اور ان کے سفر کے گوناگوں مقاصد کا کوئی باقاعدی دستاویزی ثبوت ہندوستان میں تو دستیاب نہیں؛ البتہ برطانوی ریکارڈ، بحری جہازوں کی دستاویزات اور لوگ بکس (log books)، کلیساؤں میں تبدیلیِ مذہب کے بعد بپتسما پانے والے غیر ملکیوں کی فہرستوں، ایسٹ انڈیا کمپنی کو موصول ہونے والے خطوط، مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں اور اس دور کے عمومی ادب میں ایسے ہندوستانیوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جنھوں نے بحری جہازوں کے خلاصیوں، ذاتی ملازموں اور غلاموں، نایاب نسل کے جانوروں کے رکھوالوں اور منشیوں، خانساموں یا مشرقی زبانوں کے اساتذہ کی حیثیت سے انگلستان کا سفر کیا تھا۔اس ضمن میں خود ان مسافروں کے لکھے ہوئے سفرنامے، یادداشتیں اور خطوط جس اہمیت کے حامل ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن بدقسمتی سے ایسی کوششوں کی تعداد افسوس ناک حد تک کم ہے۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق، انگلستان کا اولین سفرنامہ ۱۷۷۳ء میں، فارسی زبان میں لکھا گیا۔یہ سفرنامہ، منشی اسماعیل کی تالیف ہے اور اسے خود اس کے مصنف نے 'تاریخ جدید' کا عنوان دیا ہے۔منشی اسماعیل نے ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۳ء کے دوران بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک اعلیٰ اہل کار مسٹر کلاڈ رسل (پ: ۱۷۳۲ء)[3] کے منشی کے طور پر، ان کی معیت میں، کلکتہ سے انگلستان کا سفر کیا۔یہ سفرنامہ انھوں نے دورانِ سفر ہی ترتیب دے لیا تھا اور کلکتہ واپس آ کر غالباً اپنے کسی انگریز سرپرست کی خدمت میں پیش کر دیا۔یہ قلمی نسخہ دوسو سال تک گوشہ گم نامی میں رہنے کے بعد (جس کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے)، ۱۹۶۸ء میں برطانوی مستشرق سائمن ڈگبی (۱۹۳۲ء۔۲۰۱۰ء) کے ہاتھ لگا۔انھوں نے نہ صرف اس سفرنامے پر ایک مفصل مقالہ قلم بند کیا بلکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی کرنا شروع کیا لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اپنی وفات تک وہ اس ترجمے کو مکمل کر کے شائع نہ کروا سکے اور نہ اس کا اصل متن ہی سامنے آ سکا۔راقم الحروف کو ۲۰۱۳ء میں لندن یونی ورسٹی میں دورانِ تحقیق، اس متن کی بے حد تلاش رہی اور اسی تلاش کے نتیجے میں گذشتہ سال مارچ ۲۰۱۳ء میں اس کے اصل فارسی متن کا عکسی نقل حاصل ہوا جس کا مکمل اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔[4] مندرجات کے حوالے سے

اس تصنیف کو خودنوشت کی ذیل میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

منشی اسماعیل کا تعلق بنگال کے ایک قصبے تنج کھلنا سے تھا۔ وہ ۱۷۳۴ء[5] میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کے بارے میں دیگر مستند معاصر مآخذ سے کچھ علم نہیں ہوتا تاہم خود ان کی تحریر سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے عزت دار گھرانے کے فرد تھے جو تعلیم و تدریس سے شغف رکھتے تھے اور تصنیف و تالیف کے پیشے سے منسلک تھے۔ فارسی زبان و ادب اور منشی گری کے قوانین پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک کتاب مفتاح الاصول بھی مرتب کی تھی جو منشی گری کے قوانین اور اس کے فوائد پر مشتمل تھی۔ ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ ان کی اس کتاب نے خاصی مقبولیت حاصل کی تھی اور اکثر لوگ اس سے مستفید ہوتے تھے (قلمی نسخہ: ۱۱ الف)۔ تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا اس کتاب کا کوئی نسخہ اب تک باقی ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ معاصر تحریروں میں کہیں اس کتاب کا ذکر ملتا ہے یا نہیں؟ رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے ذخائر میں اس کتاب کا اندراج ہے نہ منشی اسماعیل کی کسی اور تصنیف کا سراغ ملتا ہے۔

تاہم انھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ تلاش معاش کے سلسلے میں جب وہ کلکتہ پہنچے تو انھوں نے اس زمانے کے فضلا کی خدمت میں حاضری دی اور اپنی تحریریں بھی ان کے ملاحظے کے لیے پیش کیں مگر کسی نے بھی ان تحریروں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ منشی اسماعیل نے بہت تلخ لہجے میں کلکتہ کے اہلِ علم و فضل کی بے رخی اور بے اعتنائی کا گلہ کیا ہے۔ اس سرد مہری سے مایوس ہو کر وہ کلکتہ سے مرشد آباد چلے گئے اور وہاں قسمت آزمائی کی۔ کچھ عرصہ وہاں گذار کر جہانگیر نگر آ گئے اور پھر دوبارہ مرشد آباد آن پہنچے (قلمی نسخہ: ۱۲ الف۔ ۱۳ الف)۔

۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۳ء تک، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تسلط علاقوں میں، کمپنی کی ناقص انتظامی پالیسیوں اور ہوسِ دولت و جاہ کے نتیجے میں خوف ناک قحط رہا، جس میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ بنگال کی تقریباً ایک تہائی آبادی اس قحط سے متاثر ہوئی۔[6] منشی کا گھرانہ بھی اس قحط کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گرانی اور غذائی قلت کا شکار ہو گیا۔ اس گرانی کے دور میں انھوں نے اپنے گھر کی قیمتی

اشیا، جن میں سونے چاندی کے زیورات، قیمتی برتن، قالین اور دیگر بیش قیمت اشیا شامل تھیں، بیچ کر اپنا اور اپنے عزیز و اقارب کا پیٹ بھرنے کا سامان کیا۔ لیکن جب یہ وسیلہ بھی ختم ہو گیا تو سرکاری یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا (قلمی نسخہ: ۱۳ الف)۔

اس ملازمت کے حصول کی تمنا کا جواز پیش کرتے ہوئے منشی اسماعیل لکھتے ہیں کہ انھوں نے انگریز صاحبان کی نوکر پروری کا حال نہ صرف سن رکھا تھا بلکہ خود بھی دیکھا تھا کہ قحط کے دنوں میں جب غلہ ایک روپے کا تین سیر ہو گیا اور وہ بھی گرد و غبار اور کیڑوں مکوڑوں سے آلودہ اور کم یاب، تو سرکار اپنے ملازموں کو پندرہ سیر فی روپیہ کے حساب سے غلہ فراہم کرتی رہی اور تمام سرکاری ملازمین فکرِ فاقہ سے آزاد اور مسرور و شادمان رہے لہٰذا وہ بھی مفلسی سے نجات کی آرزو لے کر موتی جھیل کے مقام پر آن پہنچے (قلمی نسخہ: ۱۳ ب۔ ۱۴ الف)۔ منشی اسماعیل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مقامی ہنر مند افراد برطانوی افسروں کی توجہ اور ملازمت حاصل کرنے کے لیے یہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی اس مقام پر پہنچ کر ڈیوڈ اینڈرسن (David Anderson: ۱۷۵۰ء۔ ۱۸۲۵ء، مفصل معلومات کے لیے متن کا حاشیہ ۱۰ ملاحظہ کیجیے) کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انھیں عارضی طور پر اپنی خدمات صاحبانِ عالی شان کو پیش کرنے اور ان کے سامنے اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کا موقع مل گیا۔ اینڈرسن؛ جو نظامتِ بنگالہ میں دستاویزات کی ترجمہ نویسی پر مامور تھے، اپنے منشی کی بیماری کے باعث چند فوری نوعیت کی دستاویزات کے ترجمے کے لیے ایک قابل منشی کے متلاشی تھے۔ منشی اسماعیل انھیں اپنی محنت اور قابلیت سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ جب مسٹر کلاڈ رسل نے انھیں اپنے لیے ایک قابل منشی تلاش کرنے کی درخواست کی تو اینڈرسن کی نظرِ انتخاب منشی اسماعیل پر پڑی۔ اسی توسط سے منشی کو کلاڈ رسل کی ہمراہی میں منشی کے طور پر انگلستان جانے کا موقع نصیب ہوا۔

لیکن یہ موقع حاصل ہونے سے پہلے انھوں نے جو دن موتی جھیل کے کنارے مولسری کے پیڑ کے نیچے، ایک خاک آلودہ چٹائی پر بیٹھ کر خداوندانِ نعمت کی نظرِ توجہ کے انتظار میں بسر کیے، وہ عہدِ غلامی کی تصویر کا وہ رنگ ہے، جسے منشی بے دھیانی میں، غیر شعوری طور پر بیان کر گئے ہیں۔ اس چٹائی پر بنگال کے تعلیم یافتہ افراد ہر روز اس امید میں آن بیٹھتے تھے کہ شاید کسی روز ان کی قسمت کا ستارا روشن

ہو جائے اور انھیں کمپنی سرکار کی ملازمت میں قبول کر لیا جائے۔ اس ملازمت کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت اور حریفانہ کشمکش کی جھلک بھی اس سفرنامے کے بیانات میں بین السطور جھلکتی ہے۔

منشی اسماعیل نے مسٹر کلاڈ رسل کی ملازمت خاصے تامل کے بعد قبول کی۔ اسی ضمن میں انھوں نے برسبیل تذکرہ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے پہلے بھی ایک بار انھیں ایک انگریز صاحب کی ملازمت اختیار کر کے ان کے ساتھ انگلستان کا سفر کرنے کا موقع مل چکا تھا اور اس سلسلہ میں ایک صاحب تین روز تک مندراج میں ان کے انتظار کی زحمت بھی اٹھاتے رہے تھے مگر انھوں نے بحری سفر کی دشواریوں سے ڈر کر اس ملازمت سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجتاً ایک اور منشی اس سفر پر روانہ ہو گیا اور دو سال بعد مال و دولت اور انواع و اقسام کی اشیا سے لدا پھندا لوٹا تھا (قلمی نسخہ: ۱۷ الف۔ ب)۔

منشی اگرچہ ذاتی طور پر اس سفر کو منفعت بخش خیال کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی عائلی ذمہ داریوں کا احساس بھی تھا۔ ان کے والد ضعیف و ناتواں تھے، دو بھائی کمسنی یا کسی اور سبب سے خود محتاج توجہ تھے، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک چھوٹا بیٹا تھا جس کی پرورش کی ذمہ داری تنہا انھی کے سر تھی۔ ان حالات میں سمندر پار جانے کا خیال ان کے لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔ لہٰذا منشی نے فوراً اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کر لی۔ تاہم اپنی معاشی مجبوریوں اور حالات کی تنگی ترشی کے پیش نظر بالآخر یہ سفر اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے (قلمی نسخہ: ۱۷ ب۔ ۱۸ ب)۔

منشی کے جہاز نے تین دسمبر ۱۷۷۱ء کو کلکتہ کے ساحل سے لنگر اٹھایا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاز مورس (Morse) تھا جس کے کپتان کا نام جان ہورن (John Horne) تھا۔[7] دو سال کی سیر و سیاحت کے بعد واپسی کے لیے وہ ایسٹ انڈیا کے جہاز یوروپا (Europa) میں سوار ہوئے۔[8] اس سفر کے دوران انھیں مسٹر گرانٹ (Grant)[9] کی رفاقت میسر آئی جن کی معیت میں وہ جزیرہ جوہانہ (Johanna Island) کے مقام پر پہنچے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز سے اتر کر بیس دن اس جزیرے پر بسر کیے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے فرانسیسی جہاز میں سوار ہو کر ۱۷۷۳ء میں اسی دن اور اسی تاریخ کو

بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

کلکتہ کے ساحل پر پہنچے جس دن اور تاریخ کو وہ کلکتہ سے رخصت ہوئے تھے (قلمی نسخہ: ۵۰ ب)۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منشی نے اس سفرنامے کا مسودہ سفر کے دوران ہی تیار کر لیا تھا، جس کے بارے میں انھوں نے آغاز ہی میں اطلاع دی ہے کہ سینٹ ہیلنا کے مقام پر ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس سرکاری نوکری اور اس دیار (انگلستان) کے احوال و کیفیات سادہ و سلیس زبان اور مفید انداز میں تحریر کر کے، اپنے ''آقا'' کے ذوق مطالعہ کے لیے پیش کروں (قلمی نسخہ: ۱۱ الف۔ ب)۔ اس خیال کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ سفرنامے کا جو واحد نسخہ دستیاب ہے، اس کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کا نام غلام حسن ہے اور وہ بندر ہوگلی، کلکتہ میں مقیم ہے (قلمی نسخہ: ۵۰ ب)۔

یہ قلمی نسخہ منشی نے کس ''آقا'' کی خدمت میں پیش کیا تھا، کہاں کہاں محفوظ رہا اور کیسے اس نسخے کے آخری مالک سائمن ڈگبی تک پہنچا، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی کئی کڑیاں غائب ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ منشی نے اپنی یہ تصنیف، جو انھوں نے راستے ہی میں مکمل کر لی تھی، بنگال جانے سے پہلے کلکتہ کے کسی پیشہ ور کاتب کے حوالے کر دی تا کہ وہ اس کی خوب صورت کتابت کر کے ان کے کسی محسن کو پیش کر دے۔ چند شواہد کی بنا پر سائمن ڈگبی کا خیال ہے کہ منشی نے اپنی یہ تصنیف مسٹر جیمز گرانٹ کی خدمت میں پیش کی تھی۔[10] گرانٹ کو پیش کیا گیا یہ نسخہ ۱۸۵۶ء میں کسی طور سر تامس فلپس (Sir Thomas Phillipps) کے ذخیرہ کتب (نمبر ۱۸۲۲۵) میں شامل ہو گیا اور محققین کی نظروں سے اوجھل رہا۔ ۱۹۶۸ء میں جب سائمن ڈگبی نے سر تامس فلپس کے ذخیرے کا کچھ حصہ خریدا تو یہ نادر خطی نسخہ بھی ان کے ہاتھ آیا اور انھوں نے پہلی بار اہل علم کو اس سفرنامے سے متعارف کرایا۔

سائمن ڈگبی نے سب سے پہلے اس سفرنامے کا تعارف ۱۹۷۱ء میں یونی ورسٹی آف پنسلوینیا میں پڑھے جانے والے ایک مقالے بعنوان *Changing Horizons of Thoughts in Eighteenth Century Muslim India* میں کروایا۔[11] بعد ازاں انھوں نے منشی اسماعیل اور اس کے سفرنامے کے بارے میں مبسوط معلومات پر مبنی ایک مفصل مقالہ *An Eighteenth Century Narrative of a Journey from Bengal to England: Munshi Ismail's 'New*

'History' کے عنوان سے لکھا اور یہ مقالہ رالف رسل (۱۹۱۸ـ ۲۰۰۸ء) کے اعزاز میں مرتب ہونے والے ارمغان *Urdu and Muslim South Asia* میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس سفرنامے کے متن کا انگریزی ملخص بھی تیار کیا تھا۔[۱۲] اب تک اس سفرنامے کے بارے میں تمام تر معلومات کا ماخذ سائمن ڈگبی کا یہی مطبوعہ مقالہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر محققین نے ہندوستان میں لکھے جانے والے انگلستان کے اولین سفرناموں کی فہرست میں یا تو سرے سے اسے شامل ہی نہیں کیا اور یا پھر ڈگبی کے اس مقالے کے حوالے سے مختصر سا اشارہ کر دیا ہے۔ مثلاً گل فشاں خاں نے اپنی وقیع تحقیقی کتاب *Indian Muslims' Perceptions of the West During the Eighteenth Century* میں منشی اسماعیل کا ذکر صرف چند سطروں میں کیا ہے[۱۳]، مائیکل فشر کی جامع اور مفصل کتاب *Counterflows to Colonialism* میں منشی اسماعیل کے سفرِ انگلستان کا ذکر تو ہے، مگر سفرنامے کا کوئی ذکر نہیں۔ سمونتی سین (Simonti Sen) نے بنگالی سفرناموں پر اپنی کتاب *Travels To Europe: Self and Other in Bengali Travel Narratives, 1870-1910*[۱۴] میں بنگال کے تمام سفرناموں کا ذکر کیا ہے مگر منشی اسماعیل اور ان کے سفرنامے کا ذکر غائب ہے۔ مکرجی کی مختصر سی کتاب میں انیسویں صدی کے ہندوستانی مسافروں کا مغرب کے بارے میں نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے مگر حیرت انگیز طور پر تمام مسلمان سیاحوں اور ان کے سفرناموں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔[۱۵] ڈاکٹر مظفر عالم اور سنجے سبراہنیم کی مرتبہ کتاب میں بھی ۱۴۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک کے سفرناموں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے مگر ہندوستان کے بیشتر مسلمان سفرنامہ نگاروں کا ذکر مفقود ہے۔[۱۶] ڈاکٹر اکرام چغتائی[۱۷]، ڈاکٹر تحسین فراقی[۱۸]، ڈاکٹر عبادت بریلوی[۱۹] ڈاکٹر انور سدید[۲۰] اور ڈاکٹر ثروت علی[۲۱] میں سے کسی نے بھی انگلستان کے پہلے مسلمان سفرنامہ نگار کا تعین کرتے ہوئے منشی اسماعیل کا تذکرہ نہیں کیا۔ عمر خالدی کی کتاب *An Indian passage to Europe* میں منشی اسماعیل کا نام سفرنامہ نگاروں کی فہرست میں درج ہے مگر سفر کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی۔[۲۲]

عام طور پر مرزا اعتصام الدین (۱۷۳۰ء ـ۱۸۰۰ء) کے شگرف نامۂ ولایت (۱۷۸۵ء) کو انگلستان جانے والے پہلے ہندوستانی کا سفرنامہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اعتصام الدین نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک کے عرصے میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کے دوران غالباً اپنی یادداشت کے لیے کچھ نکات بھی مرتب کر لیے تھے لیکن اس سفرنامے کی باقاعدہ تصنیف و تالیف کا عمل ۱۷۸۵ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۲۷ء میں یہ سفرنامہ پہلی بار شائع ہوا۔[۲۳] منشی اسماعیل کے مذکورہ سفرنامے کی دریافت کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کی دست یاب معلومات کے مطابق تاریخ جدید، ہندوستان میں لکھا جانے والا، انگلستان کا پہلا سفرنامہ ہے جس کی تالیف ۱۷۷۳ء میں ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ کم و بیش دو سو سال تک یہ تحریر اہلِ علم کی نظروں سے اوجھل رہی اور ۱۹۶۸ء میں محض اتفاق سے سائمن ڈگبی کے ہاتھ آن لگی لیکن اس کے باوجود مزید چھیالیس سال تک اس سفرنامے کا متن منظرِ عام پر نہ آ سکا۔ سائمن ڈگبی اس سفرنامے کا انگریزی ترجمہ شائع کرانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک ملخص بھی تیار کیا تھا لیکن اپنی مختلف النوع مصروفیات کے باعث وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے اور ۱۰ جنوری ۲۰۱۰ء میں بھارت میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے احباب نے ان کی جائیداد اور قیمتی نوادرات کا بندوبست کرنے کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا۔ اس ٹرسٹ کے زیر اہتمام لندن یونی ورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کے تعاون سے ان کی کتب کی فہرست مرتب کرنے اور ایک عالمی کانفرنس منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اتفاق سے جن دنوں یہ منصوبہ لندن یونی ورسٹی میں زیرِ غور تھا، راقم الحروف ایک پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ فیلوشپ کے لیے اسی ادارے میں موجود تھی۔ میری تحقیق کا موضوع، ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کے عرصے میں، یورپ کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لکھے ہوئے سفرناموں، یادداشتوں اور خطوط کے ذریعے اس ابتدائی نوآبادیاتی عہد میں مسلمانوں کے مغربی تہذیب کے بارے میں نقطۂ نظر کے مطالعے و تجزیے پر مبنی تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے منشی اسماعیل کے اس سفرنامے کے اصل متن کی بے حد تلاش رہی۔ فیلوشپ کا دورانیہ ختم ہونے کو تھا کہ ایک روز برسبیل تذکرہ، ڈاکٹر فرنچسکا اورسینی سے میں نے اپنی اس بے سود تلاش کا ذکر کیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے اگلے ہی لمحے اپنا کمپیوٹر کھول کر سائمن ڈگبی کے ذخیرے میں موجود قلمی نسخوں کی فہرست میرے سامنے رکھ دی۔ تاریخ جدید کا نسخہ ۱۰۷ نمبر پر موجود تھا۔ اس سے اگلا مرحلہ نسخے تک رسائی کا تھا۔ یہ ذخیرہ انگلش چینل میں فرانس کے ساحل کے قریب

ایک جزیرے جرسی آئی لینڈ میں سامّن ڈگبی کی حویلی میں موجود تھا۔میں تو اس جزیرے تک جانے کے لیے بھی تیار تھی لیکن جب پروفیسر فرینچسکا کے حوالے سے اس ٹرسٹ کے نگہبان اور سامّن ڈگبی کے دوست رچرڈ ہیرس سے رابطہ ہوا تو انھوں نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے اصل نسخے کا عکسی نقل وقفے وقفے سے برقی ڈاک کے ذریعے ارسال کرنا شروع کر دیا۔اس کے علاوہ انھوں نے سامّن ڈگبی کا تیار کردہ انگریزی ملخص اور وہ دو خطوط بھی بھیج دیے جو کنگز کالج کے پروفیسر پیٹر مارشل نے ان کے استفسارات کے جواب میں انھیں تحریر کیے تھے۔

یہ خستہ حال قلمی نسخہ کل پچاس اوراق پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے آٹھ اوراق بالکل خالی ہیں۔ پہلے اور آخری ورق کو چھوڑ کر ہر ورق پر گیارہ سطریں ہیں۔ ورق ۹ الف پر ایک گول مہر نما دائرے کے اندر یہ الفاظ درج ہیں۔

تاریخ جدید

من تصنیف منشی اسماعیل

در ۱۱۸۵ ہجری

منشی نے اس سفر کا آغاز ۱۱۸۵ ہجری میں کیا تھا لہٰذا یہ تو ممکن نہیں کہ اس کا اختتام بھی اسی سنہ میں ہوگیا ہو۔گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ تاریخ آغازِ تصنیف کی نشان دہی کرتی ہے اور اسی وجہ سے سفرنامے کے آغاز میں درج کی گئی ہے۔ کاتب نے منشی کے قلمی مسودے سے نقل کرتے ہوئے اس تاریخ کو بھی اسی طرح نقل کر دیا ہے۔

ورق ۹ ب سے اصل متن کا آغاز ہوتا ہے۔متن خطِ نستعلیق میں، صاف اور روشن حروف میں تحریر کیا گیا ہے۔آغاز میں ایک غیر معمولی بات نظر آتی ہے۔متن کے آغاز سے پہلے 'بسم اللہ الرحمان الرحیم 'اور اختتام پر "تمت بالخیر" تحریر کرنے کی روایت تو ہر دور کے مسلمان مصنفوں نے قائم رکھی ہے لیکن اس نسخے میں یہ دونوں باتیں نسخے کی پیشانی پر اس ترتیب سے درج ہیں:

وتمم بسم اللہ الرحمان الرحیم بالخیر

منشی اسماعیل اپنے مربی مسٹر کلاڈ رسل کے ہمراہ تین دسمبر ۱۷۷۱ء بمطابق پچیس شعبان

۱۱۸۵ ہجری کو کلکتہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مورس (Morse) نامی جہاز میں روانہ ہوئے۔جہاز پندرہ فروری کو کیپ ٹاؤن اور ۳۱ مارچ کو سینٹ ہیلنا کے مقام پر پہنچا جہاں کسی ناخوش گوار واقعے کے باعث مسٹر کلاڈ رسل نے باقی کا سفر اس جہاز کی بجائے کسی اور جہاز سے طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ چین کی بندرگاہ سے آنے والے ایک مال بردار جہاز میں باقی کا سفر طے کیا گیا۔ ناخوش گوار واقعے کی تفصیل میں منشی نے صرف اتنا درج کیا ہے کہ جہاز کے کپتان سے کچھ ناشائستہ حرکات سرزد ہوئیں، جنھیں درج نہ کرنے کا سبب قلم کی ناتوانی نہیں بلکہ بزرگوں کی یہ نصیحت ہے کہ رازداری پسندیدہ اور سنجیدہ عمل ہے اور اسے ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔تاہم جہاز کی لوگ بک سے معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ سفر ایک یورپی مسافر نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر افسران کی شان میں نازیبا کلمات کہے۔لیکن محض اس بات سے ناراض ہو کر مسٹر رسل کا جہاز بدلنے کا فیصلہ کر لینا قرین قیاس نہیں۔

سینٹ ہیلنا ہی وہ مقام ہے جہاں منشی کو اپنے سفر کے حالات و واقعات قلمبند کرنے کا خیال آیا (قلمی نسخہ: ۱۱ الف) اور غالباً یہیں انھوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز بھی کر دیا تھا کیوں کہ یہی وہ مقام ہے جس کی منظر کشی منشی نے سب سے زیادہ تفصیل سے کی ہے۔ پہاڑوں اور ان کے درمیان بہتے ہوئے پرشور سمندر کی موجوں، ساحلِ سمندر پر تعمیر شدہ قلعے، وہاں کی آب و ہوا، پیداوار اور آنے جانے والے جہازوں کا احوال بیان کرنے میں منشی اسماعیل نے خلافِ معمول خاصی جزئیات نگاری سے کام لیا ہے (قلمی نسخہ: ۲۶ الف۔۲۹ ب)۔یہاں سے منشی اپنے سرپرست کے ہمراہ چین سے آنے والے باربردار جہاز میں سوار ہوئے اور انگلستان کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک اور جزیرے پر قیام اور وہاں کچھوؤں کے شکار کی تفصیل بھی انھوں نے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے (قلمی نسخہ: ۳۱ الف۔۳۲ ب)۔اور بھی چند قابلِ ذکر واقعات اس سفر میں منشی اسماعیل کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔

انگلستان پہنچ کر منشی نے کچھ عرصہ لندن میں قیام کیا۔ انھوں نے لندن سے متعلق اپنے مشاہدات و تجربات کو مختصراً بیان کیا ہے۔ تاہم اس اختصار کے باوجود ان کی حیرت اور دلچسپی کا عنصر نظر آجاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ان کی حیرت کے پس پشت ان کے اپنے ملک کی معاشرت و

معیشت کی صورتِ حال بھی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر لندن میں سب سے پہلی چیز جس کا انھوں نے ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ وہاں لوگ دن رات اپنے گھروں کے دروازے بند رکھتے ہیں اور کوئی مہمان اندر داخل ہونا چاہے تو دروازے پر نصب ایک آہنی حلقے کو دروازے پر مارتا ہے، جس کی آواز سن کر گھر والے دروازہ کھول دیتے ہیں (قلمی نسخہ: ۳۸ ب)۔

دوسری بات جو انھیں قابلِ ذکر دکھائی دی،یہ تھی کہ وہاں تمام چھوٹے بڑے لوگوں کی حویلیاں بالکل ایک جیسی شکل کی ہیں اور اگر ان کے باہر کانسی کی ایک تختی پر ہر گھر کا نمبر اور مکین کا نام نہ لکھا ہو تو اپنے گھر کو شناخت کرنا بھی دشوار ثابت ہو (قلمی نسخہ: ۳۹ ب۔۴۰الف)۔ ہندوستان کے روایتی اور طبقات میں تقسیم معاشرے کے باسی کے لیے اس یکسانیت کا مظاہرہ خاصا پریشان کن تھا، لیکن منشی کے اندازِ بیان سے خوش دلی اور مسرت کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے مربی کی اجازت سے ہر روز سیر و تفریح کے لیے شہر میں نکلتے رہے، باغات کی بہار سے لطف اندوز ہوئے اور راتوں کو عشرت کدوں میں رقص بھی ملاحظہ کیے (قلمی نسخہ: ۴۰ الف۔ب)۔

سب سے زیادہ معلومات افزا تجربہ انھیں کافی ہاؤس میں ہوا جہاں کے لوازمات واہتمام سے تو وہ متاثر ہوئے ہی تھے، لیکن جس بات نے انھیں حیران کر دیا، وہ خبروں کی ترسیل میں قہوہ خانوں کا کردار تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ قہوہ خانے صرف کافی ہی پیش نہیں کرتے بلکہ خبروں کے تبادلے کا بھی بہترین ذریعہ ہیں۔ وہاں آنے والے معزز خریدار شہر بھر کی خبروں کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں اور بقول منشی غیبت اور دوسروں کے راز افشا کرنے جیسے مکروہ افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جو ان کے خیال میں زنا سے بھی زیادہ بڑے گناہ ہیں۔ قہوہ خانوں کے مالک اس گفتگو سے اخذ شدہ خبروں کو دن، تاریخ اور وقت کے اندراج کے ساتھ ملائم کاغذوں پر لکھ لیتے ہیں اور ہر روز سحری کے وقت یہی اخبار شہر کے خاص خاص لوگوں کو ماہانہ معاوضے پر تقسیم کر دیے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں قہوہ خانوں کے مالک، جو اپنے دور کے صحافی بھی ہیں، خاصی خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں (قلمی نسخہ: ۴۱ الف۔۴۳ ب)۔لندن میں اخباری صنعت کے آغاز کا یہ منظر اس عہد کی دیگر کتابوں میں بھی نظر آجاتا ہے۔[۴۴] منشی اسماعیل نے ”خبر سازی“ کے اس طریقے پر جو تبصرہ کیا ہے، اگر اس کی روشنی میں موجودہ عہد کے

ذرائع ابلاغ کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو عبرت کا خاصا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔

اگر چہ منشی کلکتہ جیسے بڑے اور یورپی طرزِ زندگی سے مانوس شہر کی سیر کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود لندن کی شہری زندگی کے لوازم انھیں حیران کرنے کے لیے کافی تھے۔ پختہ گلی کوچے، سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ”فٹ پاتھ“، راہگذاروں پر ہر دس بارہ ہاتھ کے فاصلے پر آویزاں شیشے کے فانوس جو رات کے چار بجے تک روشن رہتے تھے اور امیر و غریب سب کو یکساں مستفید کرتے تھے اور لکڑی کی چرخیوں کے ذریعے دریائے ٹیمز کے پانی کو زیرِ زمین نالیوں کے ذریعے گھر گھر پہنچانے کا بندوبست۔یہ سب باتیں منشی کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔منشی نے دریا کے تین پلوں اور ان کے محرابی دروازوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کا نظارہ پژمردہ دلوں کے لیے پیامِ مسرت تھا(قلمی نسخہ:۴۴الف۔ب)۔مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ منشی کے سفرنامے میں خواتین کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔انھوں نے اپنے معاصر سفرنامہ نگاروں کے برعکس ولایتی میم صاحبان کے حسن کے قصیدے پڑھے ہیں نہ ان کی بے پردگی یا آزادہ روی پر کوئی تبصرہ کیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منشی نے لندن کی سڑکوں، باغوں اور عشرت کدوں میں نامحرم خواتین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

لندن میں دو ماہ کے قیام کے بعد وہ مسٹر رسل کے پاس باتھ چلے گئے۔ باتھ تک کا سفر انھوں نے ایک بگھی پر کیا اور ولایت کے گھوڑوں کی تعداد اور ان کے حسن سے بے حد متاثر ہوئے۔ باتھ کے حالات بیان کرتے ہوئے انھوں نے ولایت کے طرزِ حکومت پر بھی اپنے سادہ انداز میں تبصرہ کیا ہے اور اس نظام کی جمہوری روح کو سراہا ہے۔ بادشاہ کے فیصلوں پر رعایا کے نمائندوں اور زمینداروں کی مرضی و منشا کا اثر انھیں بہت پسند آیا اور انھوں نے ٹیکس کی وصولی میں زمینداروں سے مشاورت اور ان کی رضامندی کی بھی تعریف کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات سے بھی متاثر ہوئے کہ عدالت میں سب لوگ خود اپنے بارے میں خود مختار اور دوسروں کے بارے میں بے بس ہیں اور یہ کہ بادشاہ کو وزیروں کا خوف رہتا ہے، زمیندار عوام سے ڈرتے ہیں اور عوام عدالت سے ڈرتے ہیں۔(قلمی نسخہ:۴۶الف۔۴۷ ب)

باتھ میں قیام کے دوران موسم سرما کی شدت نے منشی کے دل میں ہوائے بنگالہ کی خوش گوار

یادیں تازہ کر دیں اور غریب الوطنی کا احساس اس قدر شدید ہو گیا کہ وہ اپنے آقا کی اجازت سے واپسی کے لیے تیار ہو گئے (قلمی نسخہ: ۴۷ ب تا ۱۴۸ الف)۔ اگرچہ اس قیام کے دوران انھیں ولایت کے نازک خو، سیم بر اور یاسمین بو دلبر بھی محو خرام نظر آئے (قلمی نسخہ: ۴۶ الف) مگر یہ دلفریب منظر بھی ان کے دل سے وطن کی یاد محو نہ کر سکے اور بیس مارچ (جہاز کے ریکارڈ کے مطابق ۲۱ مارچ [۴۵]) ۱۷۷۳ء کو پورٹسمتھ (Portsmouth) کی بندرگاہ سے انھوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس جہاز کا نام یوروپا (Europa) اور اس کے کپتان کا نام ہیری ہنڈ پیلی (Harry Hinde Pelly) تھا۔ یہ جہاز بمبئی جا رہا تھا اس لیے منشی جوہانہ کے جزیرے پر پہنچ کر جہاز سے اتر گئے۔ اس سفر کے دوران ان کی ملاقات مسٹر جیو گرانٹ سے ہوئی۔ انھی کے ہمراہ انھوں نے تین ہفتے تک جوہانہ کے جزیرے پر قیام کیا، جس کے مختصر حالات اس سفرنامے میں درج ہیں (قلمی نسخہ: ۱۴۸ الف۔ ۵۰ الف)۔ بعد ازاں وہ گرانٹ صاحب کے ہمراہ ایک فرانسیسی جہاز پر سوار ہو کر دسمبر کے آغاز میں کلکتہ پہنچے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اسی تاریخ اور مہینے کو کلکتہ پہنچے، جس تاریخ اور مہینے کو دو سال پہلے یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ ان کے سفرنامے کا کاتب بھی بندر ہوگلی کا رہنے والا ہے۔ گویا کلکتہ سے اپنے گاؤں جانے سے پہلے ہی انھوں نے یہ سفرنامہ مکمل کر کے کاتب کے حوالے کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود اسے کتابت کروا کے مسٹر گرانٹ کے سپرد کر گئے ہوں یا پھر کاتب نے یہ فریضہ سرانجام دیا ہو۔ اس سفرنامے کا مبیضہ کہاں گیا؟ کیا اس کی کوئی اور نقل بھی ہوئی؟ منشی نے، جو تصنیف و تالیف کے شائق تھے، کیا اپنی اس اہم تصنیف کی کوئی نقل اپنے پاس رکھی یا نہیں؟ اگر اس سفرنامے کی کچھ اور نقول بھی تھیں تو وہ کہاں گئیں؟ کیا اس کے علاوہ بھی انھوں نے کوئی اور کتاب تصنیف کی یا نہیں؟ اس بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں۔

منشی نے اس سفر کا آغاز سینتیس برس کی عمر میں کیا اور انتالیس برس کی عمر میں وہ واپس آ گئے۔ اس کے بعد ان کی زندگی کے حالات کیا رہے؟ ایک ولایت پلٹ کو اس دور کے بنگالی معاشرے میں کس قسم کے ردعمل کا سامنا کرنا پڑا؟ منشی کے سفر سے دو سال پہلے بنگال ہی کے مرزا اعتصام الدین نے ولایت کا سفر کیا تھا اور انھوں نے بھی اس سفر کا احوال سفرنامے کی صورت میں بیان

کیا۔ کیا منشی اور مرزا اعتصام الدین میں اس حوالے سے کوئی رابطہ ہوا یا نہیں؟ یہ سب باتیں ابھی پردے میں ہیں مگر تاریخ کے یہ پردے وقت کے ساتھ ساتھ چاک ہوتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بنگال کے کسی قدیم کتب خانے سے اس سفرنامے کی کچھ اور نقول دریافت ہو جائیں اور منشی کی باقی کی زندگی کے احوال پر پڑے ہوئے دبیز پردے ہٹ جائیں۔

منشی کا یہ سفرنامہ دیگر سفرناموں کے مقابلے میں بہت مختصر ہے جس میں انھوں نے جزئیات نگاری کے بجائے محض اجمالی بیان پر اکتفا کیا ہے۔ انداز بیان اس عہد کے مروجہ اسلوب کے مطابق ادبی ہے اور جا بجا اپنی بات کی تائید کے لیے اشعار اور ضرب الامثال کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ترجمے میں بالعموم جدید املا اختیار کیا گیا ہے لیکن اسماے معرفہ کا املا برقرار رکھا گیا ہے اور جدید املا قوسین میں درج کر دیا گیا ہے اس کا مقصد قارئین کو معروف شخصیات و مقامات کے اسما کے عوام میں مروج تلفظ سے آگاہ رکھنا ہے۔ ولایت کے اس سفر کے دوران وہ جس ثقافتی صدمے کا شکار ہوئے ہوں گے، وہ بعید از قیاس نہیں لیکن ان کے اسلوب میں کہیں بھی شدت اور انتہاپسندی کا رنگ نہیں ملتا۔ اگرچہ جدید نثر کے مقابلے میں ان کا بیانیہ مبالغہ آمیز القاب و استعارات پر مبنی نظر آتا ہے لیکن ان کی آرا میں توازن اور ٹھہراؤ کی سنبھلی ہوئی کیفیت اور اسلوب میں ہمواری ہے۔ مغرب کی تہذیب و ثقافت اور ترقی دیکھ کر اچھل پڑنے کی سی کیفیت ان کے ہاں نظر نہیں آتی اور نہ ناک بھوں چڑھانے اور جا و بے جا اعتراض کرنے کی صورت نظر آتی ہے۔

بالعموم ان کا بیانیہ اور نقطۂ نظر مثبت ہے مگر جہاں انھیں کوئی بات اپنے معیار سے متصادم نظر آتی ہے تو اس کا اظہار بھی ضرور کرتے ہیں مثلاً قہوہ خانوں میں خبریں جمع کرنے کے طریقے کو انھوں نے غیبت قرار دیا ہے اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح جہاز میں کپتان کی ناشائستہ حرکات پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ اپنے تہذیبی اخلاق کو دلیل بناتے ہیں جس کی رو سے رازداری کو پسندیدہ اور سنجیدہ عمل سمجھا جاتا ہے۔ یہ باتیں منشی کے اپنے معاشرتی و تہذیبی پس منظر کا اظہار کرتی ہیں۔ ولایت جانے کا موقع ملنے پر جو بات ان کے پاؤں کی زنجیر بنتی ہے وہ اپنے ضعیف والد، دو چھوٹے بھائیوں اور بن ماں کے بیٹے کا خیال ہے جس کی وجہ سے وہ ایک مرتبہ اس سنہری موقع کو ٹھکرا

دیتے ہیں لیکن دوسری بار مفلسی اور فاقوں کے ڈر سے قبول کر لیتے ہیں۔حقوق العباد کی ان زریں مثالوں کے ساتھ ساتھ اس دور میں عمومی معاشرتی رویوں کا منفی نمونہ بھی سامنے آتا ہے۔منشی کو شکایت ہے کہ جب انھوں نے اپنی تصانیف کلکتہ کے اہل علم وفضل کے سامنے پیش کیں تو کسی نے انھیں پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ اسی طرح موتی جھیل کے مقام پر منشیوں کی آپس کی حریفانہ کشاکش بھی نظر آتی ہے۔خود منشی کا خیال ہے کہ بیشتر سرکاری منشی قابلیت میں اس سے کہیں کم مگر مواقع حاصل کرنے میں کہیں آگے ہیں۔اس کے مقابلے میں منشی کو انگریز صاحب بہادروں کا رویہ کہیں زیادہ عادلانہ محسوس ہوتا ہے۔

سیاسی شعور کے حوالے سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ منشی اور غالباً اس دور کے عوام الناس کی اکثریت اس سے قطعاً بے بہرہ تھی۔قومیت کے احساس کا شائبہ تک ان کے زبان و بیان میں نہیں اور نہ انھیں یہ احساس ہے کہ انگریز ان کی سرزمین پر ایک غاصب کی حیثیت رکھتے ہیں۔منشی نے اپنے جین حیات میں بنگال پر مقامی نوابوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوتے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے غلبہ و تسلط کو قائم ہوتے ملاحظہ کیا تھا۔۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ ان کے عہد جوانی کے واقعات ہیں جس کے بعد بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اقتدار باقاعدہ اور باضابطہ طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنبھال لیا۔ان علاقوں کی دیوانی، یعنی محصول جمع کرنے کا حق حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالیاتی پالیسیوں، لوٹ کھسوٹ اور مقامی معیشت کی تباہی پر منتج ہونے والے اقدامات سے قطع نظر، مقامی آبادی کا حصول معاش کے لیے ان کے دامن دولت سے وابستہ ہونا بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جس کا واشگاف اظہار منشی کی اس تصنیف سے ہوتا ہے۔لیکن ان کی تحریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس تبدیلی اقتدار پر دکھی یا غم زدہ تھے۔اس کے برعکس وہ جس فراخ دلی سے انگریز صاحبان کی تنظیمی صلاحیت اور ذہنی قابلیت، نیز عدل وانصاف پر مبنی روش کی ستائش کرتے ہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی نسبت انھیں اس حکمرانی کا زیادہ اہل سمجھتے تھے۔

اس اعتبار سے یہ سفرنامہ اور اسی نوعیت کی دیگر تصانیف، خاص طور پر وہ جنھیں اس دور کے طبقۂ عوام نے تصنیف کیا ہو، ہندوستان کی سماجی و معاشرتی تاریخ کا اہم ماخذ ثابت ہو سکتی ہیں۔

حواشی و حوالہ جات:

* صدر شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

** صدر شعبۂ فارسی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ انگریزی میں سفرناموں کی ترتیب وتدوین اور انھیں سنجیدہ مطالعے کا موضوع بنانے کا کام اٹھارویں صدی کے نصف اول ہی میں شروع ہو گیا تھا اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے سفرناموں کے تراجم کے باتصویر مجموعے شائع ہونے لگے تھے۔ان ابتدائی سفرناموں کے اولین مجموعوں میں سے ایک *The New General Collection of Allen, Voyages and Travels Consisting of the Most Esteemed Relations, which have been hitherto published in any language* ہے۔تین جلدوں پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۷۴۴ء میں لندن سے شائع ہوا اور اس میں واسکوڈے گاما کے سفری روزنامچے کا ترجمہ بھی شامل ہے جو پرتگالیوں کی پہلی بار ہندوستان آمد اور ان کے تجربات و تاثرات کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔

۲۔ سترھویں صدی سے انگلستان جانے والے ایشیائی باشندوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: جوزف سالٹر (Joseph Salter)، *The Asiatic in England* (لندن، ۱۸۷۲ء)؛ ہریہر داس (Harihar Das)، "The Early Indian Visitors to England"، مشمولہ *Calcutta Review*، جلد ۱۳ (۱۹۲۴ء): ۸۳–۱۱۴؛ مائیکل ایچ فشر (Michael H. Fisher)، *Counterflows to Colonialism, Indian Travelers and Settlers in Britain 1600-1857* (دہلی: ۲۰۰۴ء)؛ نسبتاً جدید تر معلومات کے لیے، اقبال وہاب، *Muslims in Brition: Profile of a Community* (لندن، ۱۹۸۹ء)۔ اور شومپا لہری (Shompa Lahiri)، *Indian Mobilities in the West, 1900-1947* (نیویارک: پالگریو میکملن) (Palgrave, Macmillan)، ۲۰۱۰ء)۔

۳۔ مسٹر کلاڈ رسل [Claude Russell] ایک قانون دان کے بیٹے تھے جو ۱۷۳۲ء میں ایڈنبرا میں پیدا ہوئے۔انڈیا میں ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز قلعہ سینٹ جارج، مدراس کی چھاؤنی میں ملازمت سے ہوا۔۱۷۶۵ء میں وہ فورٹ ولیم کلکتہ میں تعینات ہوئے اور ۱۷۷۰ء میں انھیں کلکتہ کا اکاؤنٹنٹ اور کلکٹر جنرل متعین کیا گیا۔ ۱۷۷۱ء میں انھیں دوبارہ قلعہ سینٹ جارج جانے کا حکم ملا لیکن انھوں نے واپس مدراس جانے کی بجائے، اپنی خرابی صحت کی بنا پر یورپ واپس جانے کی غرض سے ملازمت سے استعفا دے دیا۔انھیں امید تھی کہ یورپ سے واپسی پر انھیں نئے سرے سے کوئی بہتر ملازمت حاصل ہو جائے گی۔ کلاڈ رسل کا ذکر ان معروف کتابوں میں نہیں ملتا جو ہندوستان میں ملازمت کرنے والے برطانوی افراد کے ابتدائی تعارف پر بنیاد رکھتی ہیں۔مندرج بالا معلومات کا ماخذ سائمن ڈگبی کا مضمون ہے جس میں انھوں نے کنگز کالج لندن کے پروفیسر پیٹر مارشل (Peter Marshall)، ڈاکٹر رچرڈ بنگل (Richard Bingle) اور ان کے معاون کا، جو انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈ سے منسلک تھے، شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے انھیں یہ معلومات فراہم کیں۔ راقم الحروف کے پاس پروفیسر پیٹر مارشل کے دو خطوط کی نقول بھی موجود ہیں۔ ڈگبی، "An Eighteenth Century Narrative of a Journey from Bengal to England: Munshi Isma'il's New History"، مشمولہ کرسٹوفر شیکل (Christopher Shackle)، مرتب *Urdu and Muslim South Asia* (لندن، ۱۹۹۸ء)، ص ۵۴، ۶۴۔ انڈیا آفس میرین ریکارڈ میں اس جہاز کی لوگ بک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلاڈ رسل اپنے زمانے

میں خاصی اہمیت کے حامل افسر سمجھے جاتے تھے اور وہ جہاز پر سوار ہوئے تو عملے نے انھیں بنگال کونسل کے سابق رکن کی حیثیت سے تعظیم اور سلامی دی۔ L/MAR/B/480A۔

۴۔ راقم الحروف اس سفرنامے کا عکسی نقل مہیا کرنے پر ساٹمن ڈکی میموریل چیرٹی کے نگران رچرڈ ہیرس (Richard Harris) اور ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے یونی ورسٹی آف لندن (SOAS) کی پروفیسر فرنچیسکا اورسنی (Francesca Orsini) کی انتہائی ممنون ہے جن کے تعاون سے اس سفرنامے کا مکمل فارسی متن پہلی بار طبع ہو رہا ہے۔

۵۔ منشی اسماعیل نے سفرنامے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۳۷ سال کی عمر میں یہ سفر شروع کیا (قلمی نسخہ: ۱۰ ب)۔ ان کے سفر کا آغاز ۱۷۷۱ء میں ہوا اور اگر اس وقت ان کی عمر سینتیس برس تھی تو تخمیناً ان کا سنہ پیدائش ۱۷۳۴ء قرار پاتا ہے۔

۶۔ قحط بنگال کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیے: رچرڈ میلسن (Richard Melson) "Bengal Famine of 1777"، http://www.cambridgeforecast.org/MIDDLEEAST/BENGAL.html ا اکتوبر ۲۰۰۶ء تاریخ ملاحظہ: ۲۹ مارچ ۲۰۱۴ء گیارہ بجے شب۔

۷۔ منشی اسماعیل نے اپنے جہاز کا نام اور دیگر تفصیلات فراہم نہیں کیں۔ یہ معلومات اولاً پروفیسر پطر کے مذکورہ بالا خط سے حاصل کی گئیں اور بعد ازاں برٹش لائبریری میں موجود میرین ریکارڈ سے ان معلومات کی تصدیق کی گئی۔ دیکھیے: L/MAR/B/480A۔

۸۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ جہاز یوروپا (Europa) ۲۴ مارچ ۱۷۷۳ء کو بمبئی کے لیے روانہ ہوا۔ اس جہاز کے کپتان کا نام ہیری ہنڈ پیلی (Captain Harry Hinde Pelly) تھا اور منشی نے جوہانا تک اس جہاز پر سفر کیا۔ اس کے بعد وہ کلکتہ جانے والے ایک فرانسیسی جہاز میں سوار ہو گئے تھے۔ جہاز کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: برٹش لائبریری میں موجود میرین ریکارڈ، L/ MAR/ B/ 425C۔

۹۔ پروفیسر پطر مارشل کی تحقیق کے مطابق مسٹر گرانٹ سے مراد جیمز گرانٹ ہے جو Grant the informer کے نام سے معروف تھے۔ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک اور صاحب بھی مسٹر گرانٹ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کا پورا نام چارلس گرانٹ تھا لیکن وہ ۱۷۷۱ء میں عارضی طور پر ہندوستان سے چلے گئے تھے اور ۱۷۷۴ء میں واپس کلکتہ پہنچے۔ جب کہ جیمز گرانٹ ۱۷۷۲ء میں ہندوستان سے گئے تھے۔ ہندوستان واپس آنے کے لیے وہ یوروپا نامی اسی جہاز پر سوار ہوئے جس پر منشی نے واپسی کا سفر کیا۔ اس سفر کا تذکرہ ایسٹ انڈیا ہاؤس کے ایک مراسلے میں موجود ہے جو فورٹ ولیم میں بھیجا گیا تھا۔ دیکھیے: *East India House Correspondence VII, 1773-1776* (نئی دہلی: ۱۹۷۱ء)، ص ۱۳۔

۱۰۔ جیمز گرانٹ سے اس نسخے کو منسوب کرنے کی دلیل یہ ہے کہ اسی ذخیرے میں انھیں ایک اور قلمی نسخہ (تاج الدین مائلی کی مفرح القلوب) بھی ملا جس کے سرورق پر تحریر تھا کہ یہ نسخہ جیمز گرانٹ کے لیے نقل کیا گیا ہے۔ یہ دوسرا نسخہ بھی اسی ذریعے سے فلپس کے ذخیرے میں پہنچا تھا جس ذریعے سے تاریخ جدید کا نسخہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں نسخے جیمز گرانٹ کی ملکیت تھے جو اس کی وفات کے بعد کسی طور سر ٹامس فلپس کے ذخیرے میں شامل ہو گیا۔

۱۱۔ گل فشاں خاں، *Indian Muslims' Perceptions of the West During the Eighteenth Century* (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۱۰۔

۱۲۔ اس ٹائپ شدہ ترجمے کی نقل راقم الحروف کے پاس ہے۔

۱۳۔ کتاب مذکور، ص ۱۲۷-۱۳۷۔

۱۴۔ مطبوعہ نئی دہلی، ۲۰۰۵ء۔

۱۵۔ گریجا کے مکرجی (Girija K. Mookerji)، *The Indian Image of Nineteenth Century Europe* (لندن، ۱۹۶۷ء)۔

۱۶۔ مظفر عالم اور سنجے سبرامنیم (Sanjay Subrahmanyam)، *Indo-Persian Travels in the Age of Discoveries* (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء)۔

۱۷۔ پیش لفظ، تاریخ یوسفی (لاہور: مجلس ترقی ادب/ کمپنی پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۷-۳۸۔

۱۸۔ مقدمہ عجائبات فرنگ (لاہور: مکتبہ گمبس، ۱۹۸۳ء) ۱۹-۹۲۔

۱۹۔ مقدمہ سیاحت نامہ (لاہور: ادارۂ ادب و تنقید، ۱۹۸۲ء)، ص ۷-۱۷۔

۲۰۔ اردو ادب میں سفرنامہ (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد)۔

۲۱۔ تعارف سفرنامۂ فرنگ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۸۔

۲۲۔ عمر خالدی، *An Indian Passage to Europe* (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)۔

۲۳۔ اس سفرنامے کا مختصر اردو اور انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ *Shigurf namah i Velaet, or Excellenet intelligence concerning Europe, being the travels of Mirza Itesamodeen in Great Britain and France. Translated from the original manuscript into Hindoostanee, with an English version and notes* by J. E. Alexander and Munshi Shamsher Khan (لندن، ۱۸۲۷ء)۔ بعد ازاں شگرف نامۂ ولایت کے دو اور اردو ترجمے بھی شائع ہوئے: ا۔ انتظام اللہ (کراچی، ۱۹۶۳ء) اور امیر حسن نورانی (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء)۔

۲۴۔ روزمنڈ بین پاؤل (Rosamund Bayen-Powell)، *Eighteenth century London life* (لندن، ۱۹۳۷ء)، ص ۱۳۰-۱۳۲۔

۲۵۔ برٹش لائبریری میں موجود میرین ریکارڈ L/ MAR/ B/ 425C۔